**Open Access**

***Al-Irfan***(*Research Journal of Islamic Studies*)

***Published by:*** *Faculty of Islamic Studies & Shariah*
***Minhaj University Lahore***

***ISSN:*** *2518-9794 (Print), 2788-4066 (Online)*

*Volume 08, Issue 15, January-June2023,*

***Email:*** alirfan@mul.edu.pk

# اسلامی ریاست میں امن واستحکام کے ایجابی اقدامات

# The positive steps for the peace and stability in the Islamic state

***Dr. GHULAM RASOOL ZAHID***
Addl IG Investigation Punjab
grzahid2002@yahoo.com

***Dr. MANZOOR AHMED AL-AZHARI***
Associate Professor Hitec University, Wah Cantt

## *ABSTRACT*

An Islamic state is responsible to enforce glorious Quranic principles encompassing positive strategies to generate an atmosphere of peace and tranquility for its citizens. These positive steps, alongwith negative measures against threats to societal peace, ensure protection and security at each and every level. These positive measures, as ordained by Islam, include protection of fundamental human rights, establishment of social justice system, policy of mutual consultation and assignment of key positions to eligible individuals. The state is bound by Quranic guidance to encourage freedom of speech and expression of positive opinions through all available sources and means, including political parties, pressure groups and different plate forms. However, this freedom of speech is subject to unbiased commitment to Islamic principles, sincerity of purpose and intentions of honesty and well wishing. Islamic state is essentially a positive state whose Constitution, laws, rules and policies contain constructive positivity in essence.

## *Keywords:*

The holy Quran, Islamic state, human rights, social justice, freedom of expression, constructive positivity,establishment of social justice.

https://doi.org/10.58932/MULB0007

قرآنِ حکیم کی روشن تعلیمات اور اسلامی احکامات کی رُو سے ریاست اور اس کے اداروں کا فرض محض یہ نہیں ہے کہ وہ سلبی(negative)اقدامات کے ذریعے جرائم کا انسداد اور فتنہ فساد کو فرو کریں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اُن پر یہ بھی لازم ہے کہ ایجابی(positive)اقدامات کے ذریعے ایک ایسا ماحول اور معاشرہ بھی وجود میں لائیں جس میں عدل پر استوار معاشی، سماجی اور سیاسی حکمتِ عملی اور پالیسیاں نافذ کی جائیں اور امن و تحفظ پر مبنی نظام قائم کیا جائے۔ تاکہ اس ماحول میں شہریوں کے لیے نیکی کرنا آسان اور برائی کرنا مشکل ہو جائے۔ اِن اقدامات میں صحت مندانہ اور متوازن پالیسیاں ترتیب دینا، اہل افراد کو کلیدی ذمہ داریاں تفویض کرنا، تعلیم و تربیت کے ذرائع کو بروئے کار لانا اور فلاحِ عامہ کے وہ تمام اقدام کرنا شامل ہے جو عدلِ اجتماعی کا ایک خوش گوار ماحول پیدا کر دیں۔ اس حکمتِ عملی کے نتیجے میں سلبی اقدامات کی ضرورت کم سے کم تر ہوتی جائے گی اور ایک ایسی فضا قائم ہو جائے گی جس میں امن اور استحکام کا دور دورہ ہو گا اور ریاست کے شہری معاشی آسودگی اور معاشرتی طمانیت کے ماحول میں زندگی بسر کر سکیں گے۔

## قرآنی ریاست میں امن و سلامتی کا ایجابی پہلو

قرآنِ کریم میں بیان کردہ تصورِ امن و سلامتی مسلم معاشرے کی اُس رحمت اور برکت سے مزین ہے جس کے سَوتے وحی کے سرچشموں سے پھوٹتے ہیں۔ لیکن یہ تصورِ امن اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے جب معاشرہ رواداری، برداشت، حقوق و فرائض کی پاسداری اور باہمی احترام جیسے اصولوں پر استوار ہو۔ تکریمِ آدمیت اور احترامِ انسانیت کا عالمگیر اور آفاقی جذبہ نہ صرف تمام مذاہب و مسالک کو ایک دوسرے کے قریب تر کرتا ہے بلکہ انسانی وقار کے وجود و فروغ کے لیے بھی بے حد ضروری ہے۔ وہ معاشرے جو استقلال، خود کفالت اور ترقی جیسی نعمتوں سے مالا مال ہوتے ہیں، اُن کا عروج و ارتقا در حقیقت باہمی اخلاص، شائستگی اور تہذیب ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ قرآنِ حکیم جس ریاست کا وجود اور قیام چاہتا ہے وہ ایجابی ہے، یعنی اس کی فکر، اس کے قوانین و ضوابط اور اس کے نظریات مثبت حیثیت کے حامل ہوں۔

ایجابی ریاست کے بنیادی اور نمایاں اوصاف اور ان پر مبنی فکری و عملی نظم میں یہ بنیادی اصول کارفرما ہے کہ ایسی ریاست احکامِ الٰہی کے مطابق لوگوں کے بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ، اجتماعی نظامِ عدل کے قیام، شورائیت کے اصول کی پابندی اور اظہارِ رائے کی آزادی جیسی مستحکم بنیادوں پر قائم و استوار ہو۔ ان امور کو ذیل میں تفصیل سے بیان کیا جا رہا ہے:

## ا۔ انسانی حقوق:

امام شاطبیؒ نے جن پانچ اہم ترین مقاصدِ شریعت کاذِکر کیا ہے وہ دراصل ایک حقیقی اسلامی ریاست کے لیے انسانی حقوق کی نگہداشت اور تحفظ کا نصب العین ہیں:

حفظِ دین، حفظِ نفس، حفظِ نسل، حفظِ مال، حفظِ عقل۔(1)

دراصل انسانی حقوق جتنے بھی ہیں وہ انہی پانچ امور سے وابستہ ہیں۔

تہران یونیورسٹی میں اپنے خطاب کے دوران اقوامِ متحدہ کے سابق سیکرٹری جنرل کوفی عنان (Kofi A. Annan) نے کہا:

"Human rights are foreign to no culture and native to all nations; they are universal".(2)

"بنیادی انسانی حقوق کا دائرۂ کار کسی بھی علاقے اور ثقافت سے ماورا ہے۔ یہ حقوق اپنے اندر آفاقیت رکھتے ہیں"۔

ان حقوق کی بجاآوری میں فلاحی ادارے، رفاہی تنظیمیں اور سب سے بڑھ کر ریاست اپنی قوت نافذہ کے ذریعے کردار سرانجام دیتی ہے۔ ریاست اداروں اور تنظیموں کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس اعتبار سے اس کی ذمہ داریاں اور اختیارات بھی بہت زیادہ وسعت اور تنوع کے حامل ہوتے ہیں۔ اسلامی اور قرآنی اصولوں پر قائم ہونے والی ریاستیں پابند ہیں کہ وہ لوگوں کی بنیادی ضروریات اور اساسی حقوق کا خیال رکھیں اور معاشرے میں عدل وانصاف کا بول بالا کریں۔ دوسری طرف شہریوں کی جانب سے حقوق طلبی کا مطالبہ جائز قرار پانے کے لئے لازم ہے کہ ریاست سے تعاون کیا جائے، اس کے وجود کو تسلیم کیا جائے اور اس کے بنائے ہوئے مثبت قوانین کی اطاعت کی جائے۔

(1)۔ الشاطبیؒ، ابراہیم بن موسی، الغرناطی، متوفی 790ھ، "الموافقات فی اصول الشریعۃ، کتاب المقاصد"، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، 1425ھ۔2004ء، ج:1، ص:8

(2). Press Release No. HR/4344 PI/1045, UN Office of the High Commissioner, December 8, 1997

سیّد جلال الدین عمری نے ریاست کے وسیع اختیارات سے متعلق بیان کیا ہے کہ اگرچہ ریاست انسانی معاشرے کا سب سے بڑاادارہ ہے لیکن اس کی اپنی حدوداور قیود ہیں۔ ہر فرد کی فلاح وبہبود بلاشبہ ریاست کی ذمہ داری ہے لیکن یہ تب ہی ممکن ہے جب ریاست کے تمام شہری آپس میں تعاون اور تناصر سے کام لیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ریاست اور افراد کے اشتراک وتعاون ہی سے خدمتِ خلق کا حق ادا ہو سکتا ہے۔ اس کے بغیر یہ کام ہمیشہ ادھورا اور ناقص ہی رہے گا"۔(1)

کسی بھی ریاست کے شہریوں کے بنیادی حقوق اول تواُن کے باہمی تعلقات اور حقوق وفرائض کی بنیاد پر طے ہوتے ہیں۔ فرد اور ریاست کے باہمی حقوق وفرائض کی بناپر بھی بنیادی حقوق کی حدود کا تعین کیا جاتا ہے۔ انسان کے بنیادی حقوق میں سے ہر حق دراصل اُس کا وہ پیدائشی حق ہے جس سے اُسے محروم کرنا فطری قانون کی خلاف ورزی ہے۔

J.M. Williams کے الفاظ میں:

"…. inalienable fundamental rights to which a person is inherently entitled simply because he is a human being".(2)

"وہ غیر منفک بنیادی حقوق ہیں جن پر کسی بھی شخص کا پیدائشی اعتبار سے محض اس بناپر حق قائم ہوتا ہے کہ وہ بنی نوعِ انسان سے تعلق رکھتا ہے"۔

ریاست کے لیے لازم ہے کہ وہ اِن حقوق کا تحفظ انسانی بنیادوں پر کرے اور کسی کے ساتھ بھی قومیت، زبان، مذہب یا نسل کی بنیاد پر امتیاز اور تعصب کا مظاہرہ نہ کرے۔ اس سے قومیت پرستی کی جڑ کٹ جاتی ہے اور اسلامی ریاست کی عادلانہ آفاقی حیثیت مستحکم ہوتی ہے۔

---

(1)۔ عمری، سیّد جلال الدین، "اسلام میں خدمت خلق کا تصور"، اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی، 2005، ص:144

(2). Williams, J.M., "Human Rights Reference Handbook", University of Peace, Costa Rica, 2004, P.3

## ۲۔ نظامِ عدلِ اجتماعی:

اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیا کرام علیہم السلام کو مبعوث کرنے اور اُن پر اپنی کتابوں اور فرامین نازل کرنے کا بنیادی مقصد بھی اسی نظامِ انصاف کا قیام ہے، جس کا نتیجہ ظالموں کی سرکوبی اور تحفظ کی فراہمی کے ذریعے امن وامان کے ماحول کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾(1)

"بے شک ہم نے اپنے رسولؑ روشن نشانیوں کے ساتھ مبعوث کیے اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کیے تاکہ لوگ عدل وانصاف پر قائم رہیں"۔

اسی انصاف کا حکم اللہ نے اپنے انبیا علیہم السلام اور خصوصاً نبی اکرم ﷺ کو دیا:

﴿قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ﴾(2)

"آپؐ کہہ دیجئے کہ میرے پروردگار نے مجھے عدل وانصاف کا حکم دیا ہے"۔

انبیاء کرامؑ اور پیغمبروں کی بعثت کی غرض وغائیت ظلم اور ناانصافی کا خاتمہ اور نظامِ عدل وقسط کا قیام ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَسُولٌ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴾(3)

"اور ہر اُمت کے لیے پیغمبر ہے۔ پس جب ان کا پیغمبر تشریف لے آتا ہے تو ان کے مابین عدل وانصاف کے ساتھ انصاف کر دیا جاتا ہے اور ان پر کوئی ظلم روا نہیں رکھا جاتا"۔

عدل وانصاف کے کئی حوالے قرآن کریم میں متعدد مقامات پر موجود ہیں، جن کا بنیادی مقصد ریاست کا نظم قائم ہو جانے کے بعد ایسے اصولوں کا وضع کرنا ہے، جن پر عمل درآمد کی صورت میں شہری امن اور تحفظ کی زندگی گزار سکیں اور ان کے

---

(1)۔سورۃ الحدید،25/58

(2)۔سورۃ الاعراف،29/7

(3)۔سورۃ یونس،47/10

حقوق عدل وانصاف کے ساتھ ان کی دہلیز تک پہنچیں۔ان قرآنی اصولوں پر عمل کر کے ہر طرح کے ظلم وجبر کو ختم کیا جاسکتا ہے اوران پر عمل پیرا ہونے سے ہی ایک کامیاب ریاست قائم ہوسکتی ہے۔

## 3۔ ذمہ دار عہدوں پر اہل افراد کی تقرری:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ﴾(1)

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتوں کواُن کے حقیقی اہل افراد کے سپرد کردواور یہ کہ جب تم لوگوں کے مابین فیصلہ کرو تو عدل وانصاف کو ملحوظ خاطر رکھو''۔

امانت سپرد کرنے یعنی ذمہ دار عہدوں پر اہل افراد کی تقرری کا مقصد اوراس کا سب سے اہم اور ضروری پہلو یہ ہے کہ لوگوں کے مابین عدل وانصاف سے فیصلے کیے جائیں۔امین احسن اصلاحی﴿ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ﴾ کے تحت اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہیں کہ اہلِ اقتدار کی اولین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ عدل وانصاف سے کام لیں اوراس ذمہ داری کو ادا کرنے میں کسی کی مالی حیثیت یا رنگ ونسل کے بارے میں کسی تعصب کو رکاوٹ نہ بننے دیں۔عدل کرنے والے حکمران کا اللہ کے ہاں بہت بڑا صلہ ہے جبکہ عدل نہ کرنے والے کے لیے بہت سزا ہے(2)

ایک ایجابی ریاست کا منشور اور حکمتِ عملی کا رُخ ایسا ہونا چاہیے کہ وہ ہر طرح کے حالات میں انصاف پسندانہ اقدامات کرے اور ناانصافی پر مبنی فیصلوں کے لیے اپنی پالیسیوں میں کوئی گنجائش نہ رہنے دے۔ریاست کو وہ تمام وسائل اور ذرائع بروئے کار لانے چاہییں جو معاشرے میں عدلِ اجتماعی کے ذریعے امن واستحکام کو اور فلاح وترقی کو فروغ دیں۔

مولانا مودودی ایک ایجابی ریاست کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ اس کا مقصد صرف یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ لوگوں کو ایک دوسرے پر دست درازی سے باز رکھے بلکہ اس کا مدعا عدلِ اجتماعی کا متوازن نظام قائم کرنا ہے۔ایسی مثالی ریاست کا

---

(1)۔سورۃ النساء،58/4

(2)۔اصلاحی،مولانا امین احسن،''تدبر قرآن''،ج:2،ص:323

خاکہ صرف وہی ہستی عطا کر سکتی ہے جو سمیع وبصیر اور علیم وخبیر ہونے کے ساتھ ساتھ حکیم وعزیز بھی ہے۔عدل وانصاف پر مبنی ریاست کی تشکیل صرف اُنہی خطوط پر ممکن ہے جن کا تعین قرآنِ حکیم کی روشن آیات میں کیا گیا ہے۔

اسی حقیقت کی بناپر سید مودودی ریاست کے ایجابی پہلوؤں کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

'' اس معاملہ میں جو کمال درجہ کا اعتدال اسلامی نظامِ حکومت میں قائم کیا گیا ہے،اور حق و باطل کے درمیان جیسی نازک اور باریک سرحدیں قائم کی گئی ہیں،انہیں دیکھ کر ایک صاحبِ بصیرت آدمی کا دل گواہی دینے لگتا ہے کہ ایسا متوازن نظام حقیقت میں خدائے حکیم وخبیر ہی وضع کر سکتا ہے''۔(1)

اس متوازن نظام کے فیوض و برکات سے متمتع ہونے کے لیے اس فطری اور حقیقی نظام کو حقیقی معنوں میں قبول کرنے کی ضرورت ہے۔شریعتِ مطہرہ نے قرآنی احکامات کی روشنی میں اسے وضع کیا ہے اور اسی میں انسانی رفعت، عظمت اور شرف مضمر ہے۔

مصری دانشور ڈاکٹر احمد عمر ہاشم حقوق انسانی کی اساس اور اس سے وابستہ عظمتوں سے متعلق لکھتے ہیں:

''شریعتِ اسلامیہ پر کاربند ہونے پر انسان کی کرامت اور عزت و وقار کی وہ راہیں کھلتی ہیں، جن کی ایک انسان کو ضرورت ہے اور جن سے تمام مومنین یکسر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:'اور عزت اللہ اور اس کے رسولؐ اور تمام مومنین کے لیے ہے'۔اور انسانی حقوق بھی شریعتِ اسلامیہ کے ساتھ وابستگی کی صورت میں حاصل ہوتے ہیں،اور اس شریعت کی بنیاد اللہ وحدہ لاشریک کی وحدانیت کا اقرار کرنا ہے۔اور شریعتِ اسلامیہ کی حکمتیں اور برکتیں یکساں طور پر قوتِ نافذہ کے ذریعے حاکم اور محکوم،آقا اور غلام،مال دار اور محتاج تک پہنچتی ہیں۔ایمان ہی وہ بنیاد ہے جس کے ذریعے عدل وانصاف، خیر و بھلائی،اطاعت میں جلدی اور انسانی حقوق کی تنفیذ کی جا سکتی ہے''۔(2)

نبی کریم ﷺ کے بعد ریاستِ مدینہ کی باگ ڈور جن اصحاب نے سنبھالی وہ خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم ہیں، جن کے عدل وانصاف کے وہ نظائر مؤرخین نے قلمبند کیے ہیں جن کا سرچشمہ قرآنِ حکیم کی روشن آیات اور پُر حکمت تعلیمات تھیں۔

---

(1)۔مودودی، سیّد ابوالاعلیٰ،''اسلامی ریاست'' ،ص:136

(2)۔ھاشم،احمد عمر،الدکتور،''الامن فی الاسلام''،دار المنار۔مصر،ص:29

## 4۔ شورائیت:

شورائیت سے مراد ہے مشورہ دینا، مشورہ طلب کرنا، شوریٰ کے مشورے سے فیصلے کرنا، حاکم کا اپنے وزرا اور صائب الرائے لوگوں سے کسی معاملے میں مشورہ کرکے کسی کام کا آغاز کرنا۔ امام راغب اصفہانی کے مطابق: "التَّشَاوُرُ وَالمشاوَرَةُ وَالمشُوْرَةُ" کے معنی ہیں ایک دوسرے کی طرف بات لوٹا کر رائے معلوم کرنا۔(1)

مشورہ کرنے کی اہمیت اور فضیلت قرآن وحدیث میں اس درجہ تاکید سے بیان کی گئی ہے کہ اس کا مقصد اس حقیقت کو پوری طرح قلب وذہن میں جاگزیں کرنا واضح ہو جاتا ہے کہ مشورہ کے بغیر کیا ہوا ہر کام خیر سے خالی ہے۔ قرآنِ حکیم میں مشورہ کرنے کی ترغیب دو پہلوؤں سے دی گئی ہے، ایک ریاستی سطح پر حکمران کا اپنے وزرا اور مشیروں سے مشاورت کرنا۔ دوسرا انفرادی اور خاندانی سطح پر افراد کا باہم مشورہ کرکے کسی مسئلے کا حل تلاش کرنا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ﴾(2)

"آپ (ﷺ) اُن سے درگزر فرمائیے، اُن کے لیے بخشش مانگیئے، ان کے حق میں مغفرت کی دعا کیجئے اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہیے"۔

امام ضحاک رحمہ اللہ جو اولین مفسرین میں سے ہیں، آیتِ مذکورہ کے تحت فرماتے ہیں:

"مَا أَمَرَ اللَّهُ نَبِيَّهُ بِالْمُشَاوَرَةِ إِلَّا لِمَا عَلِمَ فِيهَا مِنَ الْفَضْلِ"۔ (3)

"خدا تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو اس بنا پر مشاورت کا حکم دیا کیونکہ اس میں فضیلت مضمر ہے"۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

---

(1)۔ اصفہانی، امام راغب، "مفردات القرآن"، مترجم: مولانا عبدہ فیروزپوری، ج:1، ص:559

(2)۔ سورۃ آل عمران، 159/3

(3)۔ ابن شیبۃ، ابو بکر، عبداللہ بن محمد بن ابراہیم، "المصنف فی الاحادیث والآثار"، مکتبۃ الرشد، الریاض، ج:5، ص:298، الرقم:26273

"وَلِذَلِكَ كَانَ رسولُ اللَّهِ ﷺ يُشَاوِرُ أَصْحَابَهُ فِي الأمر إذا حدث تطييبا لقلوبهم ليكون أنشط لهم فيما يفعلونه"- (1)

"اور اسی بنا پر جب کوئی امر ظہور پذیر ہوتا، رسول اللہ ﷺ دلجوئی کی خاطر اپنے اصحاب سے مشاورت فرمایا کرتے تھے تاکہ جو افعال وہ سر انجام دیں اُن میں خوشی محسوس کریں۔"

ابن غنم الاشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے فرمایا:

«لَوِ اجْتَمَعْتُمَا فِي مَشُورَةٍ مَا خَالَفْتُكُمَا» (2)

"اگر تم دونوں کسی مشورہ پر متفق ہو جاؤ تو میں خلاف نہیں کروں گا"۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"إِذَا كَانَ أُمَرَاؤُكُمْ خِيَارَكُمْ، وَأَغْنِيَاؤُكُمْ سُمَحَاءَكُمْ، وَأُمُورُكُمْ شُورَى بَيْنَكُمْ فَظَهْرُ الأَرْضِ خَيْرٌ لَكُمْ مِنْ بَطْنِهَا، وَإِذَا كَانَ أُمَرَاؤُكُمْ شِرَارَكُمْ وَأَغْنِيَاؤُكُمْ بُخَلاَءَكُمْ، وَأُمُورُكُمْ إِلَى نِسَائِكُمْ فَبَطْنُ الأَرْضِ خَيْرٌ لَكُمْ مِنْ ظَهْرِهَا"- (3)

"جب تمہارے حاکم و امیر تم میں سے بہتر و منتخب لوگوں میں سے ہوں، تمہارے مالدار سخی ہوں اور تمہارے کام باہمی مشاورت سے طے ہوتے ہوں تو زمین پر رہنا اس کے اندر دفن ہو جانے سے بہتر ہے اور جب امراء بد ترین اور شریر ہوں، مالدار بخیل ہوں اور تمہارے امور عورتوں کے ہاتھ میں ہوں تو دفن ہو جانا زمین پر زندہ رہنے سے بہتر ہے"۔

مفتی محمد شفیع حدیث بالا کی تشریح میں لکھتے ہیں:

"اس حدیث میں خصوصیت سے ان امور کو بیان کیا گیا ہے جن کو عوام کی اصلاح و فساد سے بہت کچھ تعلق ہے، گویا مدارِ اصلاح و فساد غالباً اُن امور پر ہے۔ امراء سے عام مخلوق کا تعلق ہوتا ہے۔ مالداروں کی طرف فقراء کو حاجت پڑتی

---

(1)۔ابن کثیر، اسماعیل بن عمر، ابو الفداء، "تفسیر القرآن العظیم"، ج:2، ص:131

(2)۔الشیبانی، ابو عبد اللہ، احمد بن محمد بن حنبل، "مسند الامام احمد بن حنبل"، موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ج:29، ص:517، الرقم،17994

(3)۔ترمذی، "السنن"، ابواب الفتن، بَابُ مَا جَاءَ فِي النَّهْيِ عَنْ سَبِّ الرِّيَاحِ، الرقم:2266

ہے۔ایسے ہی مشورہ بھی عام احتیاج کی چیز ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر معاملات میں باہمی مشاورت سے کام نہ لیا جائے بلکہ خود رائے یا کم عقلوں کے اقتدا سے معاملات طے کیے جائیں تو عالم میں فساد پھوٹ پڑے اور زندگی تلخ ہو جائے۔ زندہ رہ کر مبتلائے مصائب و قلق ہونے سے مر نا بدرجہا بہتر ہو جائے"۔(1)

نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے مطابق: "الْمَشُورَةُ حِصْنٌ مِنْ النَّدَامَةِ، وَأَمَانٌ مِنْ الْمَلَامَةِ"(2)

"مشورہ ندامت سے محفوظ رہنے کا قلعہ اور لوگوں کی ملامت سے امان ہے"۔

معاملہ ریاستی ہو یا ملکی، انفرادی ہو یا اجتماعی، تمام امور میں مشورہ کی اہمیت کو سمجھنا ضروری ہے۔ ایجابی ریاست کے لیے فرامینِ رسولؐ کے مطابق مشورہ کی مختلف صورتیں اور خلفائے اربعہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دورِ خلافت کی وہ روشن مثالیں آج بھی مشعلِ راہ ہیں جن کا تعلق امورِ عامۃ الناس میں رائے اور مشورے سے ہے۔

## 5۔ اظہارِ رائے کی آزادی:

بہت سے ناصح اور مصلح لوگوں کی ملکی و قومی سطح پر خیر خواہانہ تجاویز اور تنبیہات کو حکمرانوں کے آمرانہ طرزِ عمل کے ذریعے دبا دیا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں معاشرتی اور سماجی ابتری جنم لیتی ہے۔ حکومت کی طرف سے ایسی پالیسیاں اور حربے اختیار کیے جاتے ہیں جن کے ذریعے ایسی مثبت اور مبنی بر صلاح رائے کو کچل دیا جاتا ہے جس کا تعلق خالصتاً عوام کی فلاح و بہبود سے ہوتا ہے۔ موجودہ دور کی ریاستوں میں حکمرانوں کی طرف سے شہریوں کے مختلف نمائندہ طبقات کے نکتہ ہائے نظر اور نظریات کا احترام نہ کرنے کے باعث بہت سے مسائل جنم لے رہے ہیں۔ اربابِ اختیار کے ہاں قانونی ضابطوں اور تادیب کے ناجائز استعمال کے ذریعے مخلصانہ مگر مخالفانہ سوچ اور اظہارِ رائے کو دبا دیا جاتا ہے جس کا اثر براہِ راست معاشرتی و طبقاتی محرومی کی صورت میں نکلتا ہے۔

آزادیٔ اظہارِ رائے کے دونوں پہلوؤں کو قرآنِ حکیم کے بیان کردہ تعلیمات کی روشنی میں سمجھنا ضروری ہے۔ ایک پہلو مثبت ہے یعنی ایجابی۔ اس کی افادیت سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے علی الرغم ایک پہلو وہ ہے جو بظاہر تو اظہار

---

(1)۔ مفتی محمد شفیع، متوفی 1396ھ، "اسلام میں مشورہ کی اہمیت"، ادارہ اسلامیات۔ لاہور، 1976ء، ص: 45

(2)۔ الماوردی، ابو الحسن علی بن محمد بن محمد، متوفی 450ھ، "أدب الدنیا والدین"، دار المنهاج، بیروت، لبنان، 1434ھ۔2013ء، ص: 483

رائے سے تعلق رکھتا ہے لیکن دراصل اس کے اندر مثبت اوصاف کے بجائے منفی عناصر پائے جاتے ہیں۔ دونوں پہلوؤں پر ذیل میں مختصر بحث کی گئی ہے:

## (الف) منفی اظہارِ رائے:

کچھ ایسے حکمران اور اربابِ اختیار ہوتے ہیں جو اپنے طرزِ حکمرانی میں آمریت کا رویہ روا رکھتے ہیں۔ ان کی سوچ اور فکر آمرانہ طرز کی ہوتی ہے۔ اس کی نظیر قرآنِ حکیم میں فرعون کی صورت میں بیان کی گئی ہے:

﴿ قَالَ فِرْعَوْنُ مَا اُرِيْكُمْ اِلَّا مَا اَرٰى وَمَا اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ﴾ (1)

''فرعون نے کہا کہ میں تو جو بہتر دیکھتا ہوں، وہی تمہیں بھی دکھا رہا ہوں اور میں تو صرف بھلائی کے راستے کی طرف ہی تمہاری رہنمائی کرتا ہوں''۔

یعنی فرعون تمام تر نخوت اور تکبر کے باوجود بزعمِ خویش یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ صائب الرائے ہے اور لوگوں کا سچا خیر خواہ ہے۔ قرآنِ حکیم نے فرعون کی اِس بر خود غلط سوچ کی تردید کی ہے:

﴿ فَاتَّبَعُوا أَمْرَ فِرْعَوْنَ وَمَا أَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيدٍ ﴾ (2)

''سوانہوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی، اور فرعون کا حکم (رائے) سمجھداری والا نہ تھا''۔

دوسرے مقام پر فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے پیش کردہ حق کو جھٹلاتے ہوئے اپنے ارکانِ سلطنت سے رائے مانگی، جسے قرآن کریم میں ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

﴿ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ﴾(3)

''یہ (موسیٰ) چاہتا ہے کہ تمہیں تمہارے ملک سے نکال دے، سواب تم کیا رائے دیتے ہو؟''۔

اسی طرح برادرانِ یوسفؑ کے اظہارِ رائے کو دیکھا جاسکتا ہے:

---

(1)۔ سورۃ غافر، 29/40

(2)۔ سورۃ ھود، 97/11

(3)۔ سورۃ الاعراف، 110/7

﴿ اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِنْ بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ (9) قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ لَا تَقْتُلُوا يُوسُفَ وَأَلْقُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ﴾(1)

''یوسفؑ کو قتل کر دو یا کسی علاقے میں پھینک دو، تاکہ تمہارے والد کی توجہ تمہارے لئے خالص ہو جائے اور اُس کے بعد تم لوگ نیک ہو جانا۔اُن میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یوسفؑ کو قتل نہ کرو، اُسے کسی اندھے کنوئیں میں ڈال دو۔ کوئی راہ چلتا قافلہ اُسے اٹھا کر لے جائے گا، اگر تمہیں ایسا کچھ کرنا ہی ہے''۔

اسی طرح مصر کی عورتوں کی طرف سے ایک رائے کا ذکر قرآنِ حکیم میں موجود ہے:

﴿ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا رَأَوُا الْآيَاتِ لَيَسْجُنُنَّهُ حَتَّى حِينٍ ﴾ (2)

''پھر کچھ نشانیاں دیکھنے کے بعد اُن کی یہ رائے ٹھہری کہ کچھ وقت کیلئے یوسفؑ کو قید کر دیں''۔

نوح علیہ السلام کی طرف سے دعوتِ حق دینے کے بعد قومِ نوح کا ایک سردار کہنے لگا:

﴿ وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ ﴾(3)

''اور ہم تو یہی دیکھتے ہیں کہ تمہاری پیروی صرف وہی لوگ کر رہے ہیں جو ہم میں کم تر ہیں، سطحی رائے رکھنے والے''۔

قومِ نوحؑ کے سرداروں کا مصلح لوگوں کو کم تر اور سطحی رائے کا حامل خیال کرنا، فرعون کا موسیٰؑ کے مقابلے میں اہلِ مصر کو گمراہ کن حکم دینا، برادرانِ یوسف کا یوسف علیہ السلام کو قتل کر دینے، والد سے جُدا کر دینے اور اندھے کنوئیں میں پھینک دینے کی رائے دینا، زنانِ مصر کا تمام حقائق جاننے کے باوجود یوسف علیہ السلام کو جیل بھیج دینے کا تقاضا کرنا، یقیناً قرآن میں بیان شدہ اہلِ باطل کی یہ آرا اپنے اندر منفیت کے وہ تمام پہلو رکھتی ہیں جن کے ذریعے منفی اظہارِ رائے کی راہ سے امن وامان کو خطرے میں ڈال کر فتنہ وفساد کو پروان چڑھایا جاتا ہے۔

---

(1)۔سورۃ یوسف،12/9-10

(2)۔سورۃ یوسف،12/35

(3)۔سورۃ ھود،11/27

## (ب) مثبت اظہارِ رائے:

اس کے برعکس قرآنِ کریم میں مثبت رائے کو ترجیح دینے کا پسندیدہ انداز بھی بیان کیا گیا ہے، جن میں سے ایک پہلو کا تعلق اجتماعیت اور ریاستی طرز سے ہے جبکہ دوسرے پہلو کا تعلق انفرادی رویّے سے ہے۔ یمن کے حکمران ملکہ سبا کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ قَالَتْ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي أَمْرِي مَا كُنْتُ قَاطِعَةً أَمْرًا حَتَّى تَشْهَدُونِ ﴾(1)

''وہ کہنے لگی کہ اے سردارانِ قوم! اِس معاملے میں مجھے اپنی رائے سے آگاہ کرو۔ میں کسی کام کا فیصلہ اُس وقت تک نہیں کرتی جب تک تم موجود نہ ہو''۔

ملکہ سبا نے اپنے وزراء سے کہا کہ تمہاری رائے کے بغیر میری حکومتی حکمتِ عملی مکمل نہیں ہوتی اور تمام امور کو سرانجام دینے کے لیے میں تم سے رائے لیتی ہوں۔ پھر اگلی آیات میں سلیمان علیہ السلام کو تحفہ بھیجنے کا ذکر موجود ہے۔ اس کے متعلق امام قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''رَحِمَهَا اللَّهُ إِنْ كَانَتْ لَعَاقِلَةً فِي إِسْلَامِهَا وَشِرْكِهَا، قَدْ عَلِمَتْ أَنَّ الْهَدِيَّةَ تَقَعُ مَوْقِعًا مِنَ النَّاسِ''-(2)

''اللہ تعالیٰ اس (ملکہ سبا) پر رحم فرمائے اور اس سے راضی ہو، یہ حالتِ اسلام اور حالتِ شرک میں کس قدر عقل مند تھی، اسے معلوم تھا کہ تحفے کا لوگوں پر اچھا تاثر پڑتا ہے''۔

مفسرین نے ملکہ سبا کی اپنے وزراء سے رائے لینے کو بھی بطور تحسین پیش کیا ہے اور سلیمان علیہ السلام نے طرف تحفہ بھیجنے کو بھی امن وامان کی طرف پیش قدمی قرار دیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

''قالت: إن يكن نبيا لم يقبل الهدية، ولم يرضه منا، إلا أن نتبعه على دينه، وإن يكن ملكا قبل الهدية وانصرف''(3)

---

(1)۔ سورۃ النمل، 32/27

(2)۔ ابن ابی حاتم، ابو محمد عبد الرحمن بن محمد، ''تفسیر القرآن العظیم لابن أبي حاتم''، ج:9، ص:2879، الرقم:16338

(3)۔ الطبری، ابو جعفر، محمد بن جریر، ''تفسیر طبری۔ جامع البیان عن تاویل القرآن''، ج:18، ص:52

"ملکہ سبا نے کہا کہ اگر وہ تحفہ قبول کرلے تو وہ ایک بادشاہ ہوگا، لہٰذا اس سے جنگ کی جائے گی۔ اور اگر وہ تحفہ قبول نہ کرے تو وہ ایک نبی ہے۔ اس صورت میں ہم اس کے دین کا اتباع کریں گے"۔

دوسری مثال ابراہیم علیہ السلام کی اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام سے اُس گفتگو سے متعلق ہے، جس کا ذکر قرآن مجید نے ان الفاظ میں کیا ہے:

﴿ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَى فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرَى قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ﴾ (1)

"پھر جب وہ ابراہیمؑ کے ہمراہ بھاگنے دوڑنے کی عمر کو پہنچا تو ابراہیمؑ نے کہا کہ پیارے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں، سو تم بتاؤ کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ اُس نے کہا کہ ابا جان! آپ کو جو حکم دیا گیا ہے، اُسے کر گذریئے، اگر اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے"۔

## (ج) عہدِ حاضر اور آزادیٔ رائے:

یہاں عہدِ حاضر میں متعارف کردہ اظہارِ رائے کا اصول بھی قابل ذکر ہے جس کا تذکرہ "انسانی حقوق کے عالمی منشور" میں بھی موجود ہے، جو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی سے دسمبر ۱۹۴۸ کو منظور ہوا۔ اس منشور کی دفعہ ۱۹، ۱۸ اور ۲۰ آزادیٔ اظہارِ رائے کی تعریف یوں کرتی ہے:

"دفعہ ۱۸: ہر انسان کو آزادیٔ فکر، آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب یا عقیدے کو تبدیل کرنے اور پبلک میں یا نجی طور پر، تنہا یا دوسروں کے ساتھ مل جل کر عقیدے کی تبلیغ، عمل، عبادت اور مذہبی رسمیں پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

دفعہ ۱۹: ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہارِ رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنی رائے قائم کرے اور جس ذریعے سے چاہے، بغیر ملکی سرحدوں کا خیال کیے، علم اور خیالات کی تلاش کرے، انہیں حاصل کرے اور ان کی تبلیغ کرے۔

---

(1)۔ سورۃ الصافات، 102/37

دفعہ ۲۰: ہر شخص کو پُرامن طریقے سے ملنے جلنے، اور انجمنیں قائم کرنے کی آزادی کا حق ہے"۔(1)

مذکورہ بالا تینوں دفعات میں کہیں بھی اس امر کی گنجائش نہیں ہے کہ دوسرے مسلک یا مذہب کی بے توقیری کی جائے، کسی کے نظریے اور طریقۂ دعوت کو ناپسندیدہ قرار دے کر اس کے خلاف مہم جوئی کی جائے، لوگوں کی مذہبی اور فکری آزادی سلب کر لی جائے اور آزادیٔ اظہارِ رائے کا غلط استعمال کرتے ہوئے کسی مذہب کے شعائر اور مقدس شخصیات کی اہانت کی جائے۔ اس رویے سے تمام مسائل جنم لیتے ہیں اور معاشرہ ابتری اور بدامنی کا شکار ہوتا ہے۔

دورِ حاضر میں اظہارِ رائے کی آزادی کے نام پر جس طرح دوسرے مذاہب اور مسالک پر منفی پراپیگنڈہ کی بوچھاڑ کی جاتی ہے، اس سے امن و تحفظ کو شدید نقصان پہنچتا ہے۔ شر انگیز خیالات، تخریبی سوچ اور منفی حربوں کو اظہارِ رائے کا نام دے کر انسانی حقوق کو پامال جاتا ہے۔

ڈاکٹر فہیم اختر ندوی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> " آزادی اور پابندی کے الفاظ ایک دوسرے کی ضد ہیں، لیکن دونوں ایک دوسرے کے لیے ضروری بھی ہیں۔ کسی انسان یا سماج کو ایسی آزادی زیب ہی نہیں دے سکتی جسے پابندیوں کے لباس نے سجایا اور سنوارا نہ ہو۔ ایسی آزادی جس میں فرد پر تن ڈھکنے کی پابندی نہ ہو، خورد و نوش میں خبیث اشیاء کی ممانعت نہ ہو، تعبیر و اظہار میں فحش کلامی اور دلآزاری پر روک نہ ہو، اقدامات میں ایذا رسانی پر دار و گیر نہ ہو، فیصلے اور اختیارات میں مفاد عامہ کی شرط نہ ہو، رشتہ و تعلق پر قانون کا پہرہ نہ ہو اور افعال و تصرفات میں دوسروں کے حق پر بندش نہ ہو تو یہ آزادی فرد کی زندگی کو جہنم زار اور انسانی سماج کو میدانِ کارزار بنا کر رکھ دے گی۔"۔(2)

---

(1)۔انسانی حقوق کا عالمی منشور، محکمۂ اطلاعاتِ عامہ اقوام متحدہ، نیویارک، 1948ء، ص:8

(2)۔ندوی، مفتی، فہیم اختر، "اسلام میں آزادی کا تصور"، مشمولہ "اسلام کا تصور آزادی، مجموعہ مقالات"، مرتبہ صفدر زبیر ندوی، ایفا پبلی کیشنز، نئی دہلی، انڈیا، 2014ء، ص:104

## آزادیٔ اظہار کے لئے اصولی قرآنی رہنمائی:

اسلام نے ریاست کے شہریوں کو آزادیٔ اظہارِ رائے کا پورا حق دیا ہے، لیکن یہ حق قانون کی پابندی اور جائز امور کی انجام دہی کے ساتھ مشروط ہے۔ غیر قانونی سرگرمیوں اور حرام امور کا انسداد اور تدارک مقاصدِ شریعت کا اہم تقاضا ہے۔ قرآنِ حکیم میں ارشادِ خداوندی ہے کہ جو شخص سچائی کو چھپاتا ہے، وہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے:

﴿ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴾(1)

''اور گواہی کو مت چھپایا کرو، اور جو شخص گواہی کو چھپائے گا اُس کا دل گنہگار ہو گا۔ اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب جانتا ہے''۔

ایک اور جگہ فرمایا گیا:

﴿ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴾ (2)

''اور حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو، اور جان بوجھ کر حق کو مت چھپاؤ''۔

جبراً کسی کا دین تبدیل کرنے کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے:

﴿ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ﴾(3)

''دین قبول کرنے میں کوئی زبردستی نہیں ہے''۔

دوسروں کے عقائد اور مذہبی تصورات کا تمسخر اُڑانا اور اہانت کرنا بھی قرآنِ حکیم کی رُو سے سخت ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے:

﴿ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾(4)

---

(1)۔ سورۃ البقرۃ، 283/2

(2)۔ سورۃ البقرۃ، 42/2

(3)۔ سورۃ البقرۃ، 256:2

(4)۔ سورۃ الانعام، 108/6

''اور یہ لوگ اللہ کے سوا جنہیں پکارتے ہیں، تم انہیں برا بھلا مت کہو، ورنہ وہ نادانی میں حد سے تجاوز کرتے ہوئے اللہ کو برا بھلا کہنے لگیں گے''۔

ایجابی ریاست کے عہدیداروں اور ذمہ داروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ عدل وانصاف کے ضمن میں شہریت کے حقوق و فرائض سے اچھی طرح واقف ہوں، جان ومال کی حفاظت کو یقینی بنائیں، شخصی آزادی اور قانونی و معاشرتی مساوات کو فروغ دیں، حقِ ملکیت اور اس کے احترام کا اہتمام کریں اور مذہب واعتقاد کی آزادی کے حق اور اس سے متعلقہ امور کو نگاہ میں رکھتے ہوئے حکمتِ عملی تیار کریں اور عملی اقدامات اُٹھائیں۔ اُن پر لازم ہے کہ معروف کے حکم اور منکر کی نہی میں حدود اللہ کے احترام اور خیر و شر سے متعلق لوگوں کی رہنمائی کریں۔ یہ تمام چیزیں امن وامان سے براہِ راست وابستہ و متعلقہ ہیں۔ جب تک ریاست اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے آئینی اور عملی اقدامات نہیں کرے گی، شہریوں کی طرف سے قوانین کی پاسداری کرنا خام خیالی کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆